© rasailojaraid.com

بحث ونظر

فلسفۂ نظم قرآن

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

سہ ماہی تحقیقات اسلامی کا جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اس میں ایک مضمون کا عنوان ہے: "فلسفۂ نظم قرآن ۔ متوازن نقطۂ نظر"۔

نظم قرآن چونکہ میری دلچسپی کا خاص موضوع ہے، اس لیے یہ عنوان دیکھ کر فطری طور پر مجھے خوشی ہوئی اور میں اسے دیکھنے لگا۔ کرنے کو تو میں نے مضمون شروع کر دیا، مگر اس کے اختتام تک پہنچنے کے لیے مجھے کتنے پہلو بدلنے پڑے اور کتنی ریاضت کرنی پڑی، اسے بیان کرنا مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ سے نمایاں طور پر اس کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

مضمون کا انداز غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے۔ شروع سے آخر تک کھوکھلے اور بے بنیاد دعوے ہیں، کھلی ہوئی زیادتیاں اور غلط بیانیاں ہیں، غلط محاورے اور غیر محتاط جملے ہیں۔ تحریر میں زبردست الجھاؤ ہے۔ سطر سطر سے ذہنی افلاس اور فکر ونظر کی بے مائگی جھلکتی ہے۔ علم وتحقیق کے نام سے علم وتحقیق کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ "فلسفۂ نظم قرآن" نامی اس مضمون میں فلسفہ کم اور سفسطہ زیادہ ہے۔ ذیل میں ہم قدرے تفصیل سے ان نکات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

کھلی ہوئی غلط بیانی

مقالہ نگار نظم قرآن کے مسئلہ میں غلو سے پرہیز کی دعوت دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس پس منظر میں ہند میں تفسیر کے ایک خاص مکتب فکر کی طرف سے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظم قرآن کو دین و ایمان کا اصل مسئلہ، اور اس کی طرف عدم توجہ کو امت کی تمام خرابیوں کی جڑ، اور اس کے تمام تر افتراق و انتشار کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، یہ مبالغہ آمیز ہے" ص۲۷

پھر آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں:

"قرآن و سنت کی تعبیر اور دین کے کسی حصہ کی ترجمانی کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر مرحلہ میں اعتدال و توازن سے رشتہ استوار رہے اور تعبیر کے کسی جز میں مبالغہ آرائی، غلو اور تشدد کو در آنے کا موقع نہ ملے" ص۲۷

ان سطور میں فراہی مکتب فکر پر غلو، تشدد اور مبالغہ آرائی کا الزام جس تحریر کے حوالہ سے لگایا گیا ہے، وہ فاتحہ تفسیر نظام القرآن کے صفحہ ۳۔۴ کی ایک عبارت ہے جس کا اردو ترجمہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ قارئین خود اندازہ کر سکیں کہ مقالہ نگار امانت و دیانت کے تمام حدود کو پھلانگتے ہوئے کس طرح سورج کو چراغ دکھانے اور نور کو ظلمت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

علامہ فراہیؒ کی عبارت

ترجمان القرآن علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں:

"یہ ایک واضح سی بات ہے کہ نظم کلام کلام ہی کا ایک جزء ہوا کرتا ہے۔ اب اگر اسے چھوڑ دو تو کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔ ترکیب میں زائد مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، جو اس کے الگ الگ اجزاء میں نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ اگر کوئی فہم نظام سے محروم رہ گیا تو وہ کلام کے ایک بڑے حصے سے محروم رہ جائے گا۔ اور بہت اندیشہ ہے کہ اس کا وہی حال ہو جائے جو اس سے پہلے اہل کتاب کا ہوا۔ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔

فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینہم العداوۃ والبغضاء إلى یوم القیامۃ (پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش کر دیا، جس کے ذریعہ ان کی یاددہانی کی گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی۔)

مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ باہمی عداوت اور دشمنی جس میں یہ امت مسلمہ مبتلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہیں یہ اسی نسیان کا نتیجہ نہ ہو۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ان کی عداوتوں کی آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ اور ان کے آپس کے اختلافات ختم ہونے پر نہیں آتے۔

اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کی، کیونکہ جب کلامِ الٰہی کے معانی میں ہمارے درمیان اختلاف ہوگا تو لازماً ہماری خواہشوں میں بھی اختلاف ہوگا اور ہمارا وہی حال ہوجائے گا جو اہل کتاب کا ہوا۔ فرق بس اتنا ہوگا کہ وہ اپنے اختلافات سے نجات پانے کے لیے اس نبی اور اس قرآن کا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے لیے اس کتاب محفوظ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں رہ گئی۔"

علامہ فراہیؒ کی یہ وہ تحریر ہے جسے لے کر مضمون نگار نے اس مکتب فکر پر غلو، تشدد، مبالغہ آرائی اور قرآن وسنت کی تعبیر میں بے اعتدالی کا الزام لگایا ہے

خاک اڑانے کا حاصل؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تحریر کے کس جزء سے وہ سارے نکتے پیدا ہو رہے ہیں، جن کی دریافت سے فاضل مضمون نگار اس قدر مضطرب ہیں؟

کس نے کہا ہے، نظم قرآن دین وایمان کا اصل مسئلہ ہے؟

کس نے کہا ہے، نظم قرآن سے بے توجہی امت کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے؟

کس نے کہا ہے، امت کے تمام تر افتراق وانتشار کی اصل وجہ نظم قرآن سے غفلت ہے؟

علامہ فراہیؒ نے جو بات فرمائی ہے، وہ تو بہت ہی واضح اور صاف ہے۔ کوئی بھی صاف ذہن کا آدمی اسے پڑھے تو ممکن نہیں اسے کوئی غلط فہمی ہو۔

کیا کوئی بھی پڑھا لکھا بالغ نظر آدمی اس سے انکار کرسکتا ہے کہ نظم کلام، کلام کا ہی ایک جزء ہوا کرتا ہے؟

اب اگر نظم کلام کلام کا ہی جزء ہوا کرتا ہے تو کیا نظم قرآن، قرآن کا ہی جزء نہ ہوگا؟

پھر اگر نظم قرآن بھی قرآن کا ہی جزء ہے، تو کیا اسے سمجھنا، اس پر غور کرنا اور اس کی وسعتوں اور گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہمارے لیے ضروری نہ ہوگا؟

پھر یہ بات ہمیں خود قرآن پاک سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دلوں کو جوڑنے والی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب ہے۔ اسی کتاب کی بدولت وہ لوگ جو کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اور باہمی نفرت و عداوت کی آگ میں جل بھن رہے تھے، دیکھتے دیکھتے باہم شیر وشکر اور یک جان دو قالب ہو گئے۔

کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی ہے کہ یہ امت اگر اس کتاب سے غافل ہوئی تو اخوت و محبت کی نعمت سے وہ محروم ہو جائے گی اور اس کی صفوں میں پھر وہی دشمنیاں عود کر آئیں گی، جن میں وہ پہلے مبتلا تھی؟

اب اگر آج ایک صاحب دل اور صاحب نظر اپنے سر کی آنکھوں سے یہ دیکھتا ہے کہ امت قرآن سے غافل ہے، ساتھ ہی یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو چکی ہے اور اس سے اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس انتشار و افتراق کا سبب شائد قرآن سے بے اعتنائی اور فہم قرآن سے محرومی ہے، تو آخر اس میں کیا چیز ہے جسے غلو یا تشدد، یا بے اعتدالی کا نام دیا جا سکتا ہو؟

قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ اس صاحب نظر نے یہ بات بھی ادّعائی انداز میں نہیں کہی ہے، بلکہ نہایت ہی دردمندی اور منکسر مزاجی کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ.....

فکر و نظر کی بے مائگی

اسی نظم قرآن پہ مزید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار رقم طراز ہیں:

"قرآن نے جو اس امت کو خیر امت کہا ہے تو اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قیامت تک کے لیے اس امت کی یہ خیریت اسی طرح باقی رہے گی یہی بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ قیامت تک یہ امت دین کے صحیح راستے پر قائم رہے گی۔ نیز یہ کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر اکٹھا نہ ہوگی..... جس امت کا قرآن و سنت میں یہ مقام ہو، اسے محض نظم قرآن میں غفلت سے یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا، اور ان کے گناہوں کی مجرم نہیں گردانا جا سکتا، جیسا کہ نظم قرآن کے مؤید مخصوص حلقے کی طرف سے اسے اسی جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔"[۲۷]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیرِ امت ہونے کا مسئلہ

یہاں مضمون نگار سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ آیت کریمہ میں خیر امت کسے کہا گیا ہے؟ اور جنھیں کہا گیا ہے تو غیر مشروط طور پر کہا گیا ہے یا کچھ متعین شرطوں کے ساتھ کہا گیا ہے؟

اگر مشروط طور پر کہا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ مشروط طور پر کہا گیا ہے، تو کیا ان شرطوں کے بغیر بھی کوئی گروہ خیر امت کہا جا سکے گا؟

پھر جو بات مشروط طور پر کہی گئی ہو، کیا اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا صحیح ہوگا کہ وہ بات لازماً قیامت تک باقی رہے گی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

سیأتی علی الناس زمان یکون القرآن فی واد وھم فی واد (سنن نسائی)

(عنقریب اس امت پر ایک دور ایسا آئے گا جب قرآن ایک وادی میں ہوگا، اور یہ امت دوسری وادی میں ہوگی یعنی دونوں کا راستہ الگ الگ ہوگا)

اس حدیث رسول کا کیا مطلب ہے؟ کیا قرآن سے دور ہو کر بھی یہ امت خیر امت ہی کہی جائے گی؟

ایک دوسری حدیث آتی ہے:

کیف انتم إذا طغی نساءکم وفسق شبابکم وترکتم جھادکم؟ (مسند ابو یعلی)

(کیا حال ہوگا تمہارا، جب کہ تمہاری عورتیں سرکش ہو جائیں گی، تمہارے جوان فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور تم اپنے جہاد سے کنارہ کش ہو جاؤ گے؟)

تو کیا فسق و طغیان اور ترک جہاد کے بعد بھی یہ امت خیر امت ہی باقی رہے گی؟

آپؐ کا ارشاد مبارک ہے:

کیف انتم اذا امرتم بالمنکر ونھیتم عن المعروف؟ (مسند ابو یعلی)

(کیا حال ہوگا تمہارا جب تم بدی کا حکم دینے لگو گے اور نیکی سے روکنے لگو گے؟)

تو کیا منکر کی علمبردار اور معروف سے برسرِ پیکار ہوتے ہوئے بھی یہ امت خیر امت ہی باقی رہے گی؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ الزام ہے یا حقیقت

مضمون نگار کا یہ دعویٰ ہے کہ امت یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا، اور ان کے گناہوں کی مرتکب نہیں ہو سکتی اور اس بات کو وہ نظم قرآن کے مؤید مخصوص حلقے کی طرف سے اس امت پر ایک الزام قرار دیتے ہیں۔

ہم ان سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ یہ حدیثیں بھی کبھی ان کی نظر سے گزری ہیں:

لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً بشبرٍ وذراعاً بذراعٍ حتى لو دخلوا في جحر ضب لاتبعتموهم، قلنا يا رسول الله اليهود والنصارى؟ قال: فمن؟ (ترمذی)

(یقیناً تم ان لوگوں کے راستوں پر چل پڑو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تم میں اور ان میں ایک بالشت اور ایک ہاتھ کا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے ہوں گے، تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے اور اس بل میں داخل ہو گے۔ ہم نے عرض کیا، اللہ کے رسول، کیا یہود و نصاریٰ کی پیروی؟ آپؐ نے فرمایا: اور کس کی؟)

ایک دوسری روایت ہے، جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے آتی ہے، کہ آپ نے فرمایا:

ليأتين على امتي ما أتى على بني اسرائيل حذو النعل بالنعل حتى إن كان منهم من أتى امه علانية لكان في أمتي من يصنع ذالك، وان بني اسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة وتفترق امتي۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

(یقیناً میری امت پر بھی وہ وقت آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا۔ دونوں کے حالات اسی طرح مشابہ ہوں گے جس طرح ایک پیر کا جوتا دوسرے پیر کے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص گزرا ہو گا جس نے علی الاعلان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہوگی، تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو یہ کام کریں گے۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے، میری امت بھی اسی طرح بٹ جائے گی)

کیا یہ حدیثیں اس مفہوم میں بالکل واضح نہیں ہیں کہ یہ امت بھی کسی دور میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا ہو جائے گی؟

ہو سکتا ہے فاضل مقالہ نگار یہاں یہ کہہ گزریں کہ یہ احادیث تو نظم قرآن سے مستفاد معلوم ہوتی ہیں، اور ہم کوئی بھی ایسی بات ماننے کے قائل نہیں جو نظم قرآن کی راہ سے آئے۔ ہم رسول پاک کی بھی صرف وہی باتیں مانیں گے جو نظم قرآن کی بو اپنے اندر نہ رکھتی ہوں!

فاضل مقالہ نگار کی جو مزاجی کیفیت ہے، اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں، نظم قرآن اور صاحب نظام القرآن سے انھیں جو عناد ہے، وہ ان کی زبان گہربار سے ہر بات کہلوا سکتا ہے۔

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

زبردست ذہنی افلاس

فاضل مقالہ نگار علم و حکمت کے موتی رولتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

"اب اگر سخت گیر نظام قرآن کی بدولت ہر لفظ کے ایک ہی معنی اور ہر آیت کی ایک ہی تاویل کی گنجائش رہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ اس مطلوب تفسیر کے بعد کتاب اللہ کے عجائبات ختم ہو گئے اور رب کی باتیں ایک خاص تفسیر کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ یہ کتاب اللہ کی مدح نہیں، اس کی قدح ہے۔"(۹)

وہ لوگ جو علم تفسیر سے دلچسپی رکھتے اور قرآن پاک کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے مفسرین کرام نے ایک ایک آیت کی تاویل میں دو دو درجن اقوال نقل کیے ہیں۔ انھیں کسی آیت کی تاویل و تفسیر میں جتنی بھی رائیں مل سکیں، وہ ساری رائیں انھوں نے کمال احتیاط اور کمال دیانت داری کے ساتھ محفوظ کر دیں۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑے کہ ان میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط، بلکہ یہ فیصلہ خود قارئین اور محققین پر چھوڑ دیا۔

مثال کے طور پر ہم سورۂ فجر کو لیتے ہیں۔ اس سورہ کی پہلی آیت ہے۔

"والفجر و لیال عشر والشفع والوتر واللیل اذا یسر"

اس آیت میں "فجر" سے کیا مراد ہے؟ اس کے سلسلے میں امام قرطبیؒ (۸) اقوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقل کرتے ہیں۔ "لیالِ عشر" سے کیا مراد ہے؟ اس کے سلسلے میں (۴) اقوال نقل کرتے ہیں۔
"الشفع والوتر" سے کیا مراد ہے؟ اس کے سلسلے میں (۲۱) اقوال نقل کرتے ہیں۔
"واللیل اذا یسر" سے کیا مراد ہے؟ اس کے سلسلے میں (۶) اقوال نقل کرتے ہیں۔
اسی طرح سورہ کوثر ہے۔ اس میں کوثر سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں وہ (۱۶) اقوال نقل کرتے ہیں۔

پھر ایسا نہیں ہے کہ یہ سارے اقوال جو کسی آیت یا کسی لفظ کی تاویل میں نقل کیے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ تنوع کا رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ بارہا وہ باہم مختلف اور متناقض ہوتے ہیں، اس طور سے کہ ان میں سے کسی ایک کو ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

نظم کلام کی مشعل

ایسے مواقع پر ایک مفسر یا ایک طالب قرآن کو سخت زحمتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ ان بہت سارے اقوال میں سے کس کو صحیح کہے اور کس کو غلط؟ کس کو اختیار کرے اور کس کو ترک کرے؟

ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ یہ فرماتے ہیں کہ یہ زحمت ہمیں اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم نظم کلام یا نظم آیات کو سامنے نہیں رکھتے۔ اگر ہم نظم کلام کی مشعل ہاتھ میں رکھیں، اور آیات کے سیاق وسباق سے غافل نہ ہوں تو ہم آسانی کے ساتھ ان بہت سے اقوال میں سے کسی ایک قول صحیح تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح کے مواقع پر جو ہمیں حیرانی ہوتی ہے، اس سے نجات پا سکتے ہیں۔

جناب سلطان احمد اصلاحی علامہ فراہیؒ کی اس بات سے سخت برہم ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اس سے تو کتاب الٰہی کے عجائبات ہی ختم ہو جائیں گے اور رب کی باتیں ایک خاص تفسیر کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جائیں گی۔

وہ فرماتے ہیں، یہ کتاب اللہ کی مدح نہیں، یہ تو اس کی قدح ہے۔

ان کا کہنا ہے یہ مختلف اور متناقض تفسیری اقوال عظمت قرآن کے لیے قادح نہیں، بلکہ ان سے کتاب اللہ کی وسعت اور اس کے معانی کی پہنائی کا ثبوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فراہم ہوتا ہے۔ جو اس کی بڑائی اور برتری کی دلیل ہے۔

یہ دعویٰ کس نے کیا؟

یہاں مقالہ نگار سے یہ پوچھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الٰہی کی وسعتوں کو قید کرنے کا دعویٰ کس نے کیا ہے؟ کیا بہت سے متضاد اور متناقض اقوال میں سے کسی ایک راجح قول کے انتخاب سے کلام الٰہی کی وسعتیں قید ہو جاتی ہیں؟

یہاں تو نظریۂ نظم قرآن کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہی یہ دی جاتی ہے کہ اس سے نہ صرف کلام الٰہی کے صحیح مفاہیم تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے، بلکہ اس سے قرآن کی اک اک سورہ، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، علوم و معارف کا ایک بحر بے کراں نظر آنے لگتی ہے۔

اگر اس دعوے پر کوئی روشن دلیل درکار ہو تو علامہ فراہی کی تفسیر سورۂ کوثر یا تفسیر سورۂ اخلاص کا مطالعہ کافی ہوگا۔

محض یہ نظم کلام یا ربط آیات پر غور و تدبر کا نتیجہ ہے کہ علامہ فراہیؒ نے ان دونوں چھوٹی چھوٹی سورتوں کے اندر علوم و معارف اور اسرار و حکم کا ایک بحر زخار دریافت کر لیا، ورنہ جو لوگ نظم آیات کے قائل نہیں، یا جن کے ہاں اس کا زیادہ اہتمام نہیں، ان لوگوں نے بھی ان دونوں سورتوں کی تفسیریں لکھی ہیں۔ ان دونوں تفسیروں کا موازنہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ نظم کلام پر غور و تدبر سے نہ صرف آیات کا صحیح مفہوم روشن ہو جاتا ہے، بلکہ ان کے اندر اسرار و معارف کی اک دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ جو اس صورت میں کبھی نہیں نظر آ سکتی جب کہ نظم آیات سے بے اعتنائی برتی گئی ہو۔

اصولوں سے عداوت

پھر فاضل مقالہ نگار نظم قرآن کا متوازن نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علوم میں زیادہ اصولوں کا چکر ان کی راہ کی رکاوٹ ہے .... صحیح بات یہ ہے کہ دیگر علوم کے مقابلے میں کتاب اللہ اصول کی بھول بھلیوں سے زیادہ بے نیاز ہے۔" ص ۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاضل مقالہ نگار ایک آزاد طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ کسی قسم کی پابندی یا باضابطگی کے قائل نہیں۔ کوئی بھی اصول اور کوئی بھی ضابطہ ان کی طبیعت پر سخت گراں گزرتا ہے۔

علامہ فراہی سے ان کا جو اصل اختلاف ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے علم تفسیر کو ایک مدوّن علم کی شکل کیوں دے دی؟ اس کے لیے اصول وضوابط کیوں وضع کیے؟ پھر ان اصولوں کی اپنی تفسیر قرآن میں سختی سے پابندی کیوں کی؟ اور کیوں دوسروں کو اس کی تلقین کی کہ وہ ہمیشہ تفسیر قرآن کے ان بنیادی اصولوں کو مشعل راہ بنائیں؟

ان کے خیال میں عام روایت سے ہٹی ہوئی متنوع تفسیر قرآن زیادہ لائق توجہ ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

"فقہ اور تصوف کی دنیا اس کے سلسلے میں بہت مال دار ہے۔ گو کہ سکڑی معلومات کی حامل اور محدود مطالعہ کی خوگر امت کی اکثریت کو اس کا پتہ نہ ہوا ور علم ومعرفت کے ان انمول خزانوں سے اس کا دامن خالی ہو۔" ص ۸۱

پھر وہ آگے مسلمان علماء اور اسکالرس کو دعوت سخن دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تصوف کے اولین بنیادی مراجع سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تشریح وتفسیر میں حضرات صوفیائے عظام کے اچھوتے اور نادر نکات کو جمع کیا جاسکے تو بہترین تفسیر کے ساتھ حدیث نبوی کی لاجواب شرح تیار ہو۔" ص ۸۹

فاضل مقالہ نگار حضرات صوفیائے عظام کے کیسے اچھوتے اور نادر نکات کے دلدادہ ہیں، اس کی وضاحت کے لیے ہم تصوف کے بنیادی مراجع سے تفسیر قرآن کے چند نمونے یہاں پیش کیے دیتے ہیں تاکہ قارئین کو صحیح اندازہ ہوسکے کہ وہ کس گلزار سے نکال کر کس خارزار میں ملت کو لے جانا چاہتے ہیں اور وہ کس طرح تفسیر قرآن کی سنجیدہ اور علمی کوششوں پر خاک اڑا کر تحریف قرآن کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔

متصوفانہ تفسیر کے چند نمونے

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی "والسماء ذات البروج" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ" روح انسانی ہے جو ترقی اور درجات کے لحاظ سے مقامات رکھنے والی ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ" وہ قیامت کبریٰ ہے جو کشف توحید ذاتی کے درجات میں روح انسانی کا آخری درجہ ہے۔ یعنی جب روح ترقی کرتی ہوئی فانی فی اللہ ہو جاتی ہے اور یہی مقام اس کے لیے قیامت کبریٰ (بڑی قیامت) ہے۔"

سورۂ والنازعات میں "الطامۃ الکبریٰ" کی تاویل یہ ہے:

"یعنی وحدت ذاتیہ کے نور کی تجلی جو ہر شئے کو ڈھانپ لیتی اور پھر اس کو مٹا دیتی اور محو کر دیتی ہے۔"

"اذا الشمس کورت" میں شمس سے مراد روح کا سورج اور "کورت" سے مراد روح کا جسم سے نکل جانا، اور "اذا السماء انفطرت" میں آسمان سے مراد روح حیوانی کا آسمان ہے۔"

(ملاحظہ ہو تصوف اور اہل تصوف، مولانا سید احمد قادریؒ: ۲۹۷ — ۲۹۸)

آیاتِ محکمات و متشابہات

حضرت شیخ احمد سرہندی اپنے مکتوب ۲۷۶ جلد اول صـ۳۵۷ میں قرآن پاک کی آیات متشابہات کو علم حقائق و اسرار کا مخزن قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہاتھ، چہرہ، قدم، ساق اور انگلیاں، یہ الفاظ جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں، یہ سب متشابہات میں سے ہیں۔ اسی طرح حروف مقطعات جو قرآن کی سورتوں کی ابتدا میں ہیں، یہ بھی متشابہات میں سے ہیں۔ اس کی تاویل (حقیقت و مفہوم) کی اطلاع کسی کو نہیں دی گئی ہے۔ البتہ علماء راسخین کو اس کی اطلاع دی گئی ہے۔ یہ خیال نہ کریں کہ ید کو قدرت کے معنی میں لینا اس کی تاویل ہے، یا وجہ کا لفظ ذات کی تعبیر ہے۔ بلکہ یہ سب گہرے اسرار ہیں جو اخص خواص کو بتائے گئے ہیں۔

حروف مقطعات کے بارے میں کیا لکھوں کہ ان کا ہر حرف عاشق و معشوق کے درمیان مخفی اسرار کا بحر مواج اور محبّ و محبوب کے درمیان دقیق رموز کی گہری علامت ہے۔

محکمات اگرچہ امہات کتاب ہیں لیکن متشابہات جو ان امہات کتاب کے نتائج و ثمرات ہیں وہ مقاصد کتاب ہیں۔ امہات ان نتائج کے حصول کے لیے وسائل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ نہیں ہیں۔

پس کتاب اللہ کا مغز متشابہات ہیں اور محکمات کتاب اس مغز کا چھلکا ہیں۔ یہ متشابہات ہی ہیں جو رمز و اشارے میں اصل کو بیان کرتی اور اس مرتبہ کے حقیقت معاملہ کی نشاندہی کرتی ہیں بخلاف محکمات۔ متشابہات حقائق ہیں اور محکمات ان حقائق کے لیے بمنزلہ صور و اشکال ہیں۔

عالم راسخ وہ ہوتا ہے جو مغز کو چھلکے کے ساتھ جمع کرسکتا اور حقیقت کو صورت میں اتار سکتا ہے۔ علماء قشر (چھلکے کے علماء) چھلکے پر خوش ہیں اور انھوں نے محکمات پر اکتفا کر لیا ہے۔" (تصوف اور اہل تصوف۔ مولانا سید احمد قادریؒ: ۳۲۱، ۳۲۲)

قرآن ایک حجاب

حضرت شیخ احمد سرہندی نے جو متشابہات کو مغز اور محکمات کو چھلکے سے تعبیر کیا ہے، یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جو علامہ ابن جوزیؒ نے کسی بزرگ صاحب طریقت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہایت بے باکی سے کہا کرتے تھے، کہ "قرآن حجاب ہے۔ رسول حجاب ہے۔ بجز عبد اور رب کے کچھ بھی نہیں"۔ (تلبیس ابلیس ص ۳۲۴)

آیات محکمات جنھیں اللہ تعالی نے ام الکتاب یعنی اصل کتاب فرمایا ہے، ان کو چھلکا قرار دینا، اور آیات متشابہات، جن کے چکر میں پڑنے سے منع فرمایا گیا ہے، ان کو مغز قرآن کہنا قرآن کو حجاب کہنے کے ہی مترادف ہے۔

صوفیائے عظام کے یہ وہ اچھوتے اور نادر نکات ہیں جنھیں فاضل مضمون نگار بہترین تفسیر اور علم و معرفت کے انمول خزانے تسلیم کرتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ کس قدر بے بنیاد اور قرآنی الفاظ، قرآنی اسالیب اور قرآنی تصریحات سے کس درجہ متصادم ہیں۔

یہی وہ نادر نکات اور انمول خزانے ہیں، جن کا راستہ روکنے کے لیے ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ کو علم تفسیر کے اصول و قواعد مدون کرنے پڑے۔ لہٰذا اگر مضمون نگار ان اصول و قواعد کی مخالفت کرنے اور ان پر شبخون مارنے کے لیے بے چین رہتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

ہاں البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ چونکہ جناب مضمون نگار کو اصولوں سے سخت نفرت ہے، وہ قواعد وضوابط کے نام سے ہی مشتعل ہوجاتے ہیں، لہٰذا فطری طور پر الفاظ کے معانی ومفاہیم کے سلسلے میں ہماری اور ان کی ڈکشنریوں میں بڑا فرق ہوجاتا ہے۔

مثلاً اعتدال وتوازن کا مفہوم ان کے ہاں وہ نہیں ہوتا، جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو تفسیر میں اعتدال کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے جو بنیادی اصول ہیں، ان سے سر مو انحراف نہ کیا جائے اور ہر حال میں ان اصولوں کی اس طرح پابندی کی جائے کہ کہیں سے اس میں افراط یا تفریط نہ ہونے پائے۔

جبکہ مضمون نگار کے ہاں یہی چیز تشدد اور بے اعتدالی کہی جائے گی۔ اعتدال یہ ہوگا کہ کسی ضابطہ کا پابند ہوکر نہ رہا جائے اور کوئی غلط سے غلط تاویل بھی سامنے آئے تو اسے خوش آمدید کہا جائے۔ بلکہ اپنی متاع گمشدہ سمجھ کر اسے حرز جاں بنا لیا جائے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

..یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مضمون کا عنوان تو یہ قائم کیا ہے: "فلسفۂ نظم قرآن — متوازن نقطۂ نظر" لیکن اس میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے وہ سرتاسر بے اعتدالی اور عدم توازن کا بولتا ہوا نمونہ ہے۔

اسی طرح بے لچک تقلید، تقلید اعمیٰ، تقلید جامد وغیرہ الفاظ، جن کا وہ بکثرت استعمال کرتے ہیں، ان کے ہاں ان الفاظ کا وہ مفہوم نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

ان کے ہاں تو تقلید جامد کا مطلب ہوتا ہے علامہ فراہیؒ کی کسی بات یا کسی تحقیق کو قبول کرلینا، چاہے وہ قرآن وسنت کے کتنے ہی محکم اور ٹھوس دلائل پر مبنی ہو!

ان کے ہاں تقلید اعمیٰ کا مطلب ہوتا ہے نظم قرآن پر غور وتدبر کرنا، اور اس کے اندر علوم ومعارف کی جو کلیاں پوشیدہ ہیں، انھیں دریافت کرنے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوشش کرنا!

ان کے ہاں بے لچک تقلید کا مطلب ہوتا ہے ان رکیک اور بے بنیاد تاویلات کو رد کر دینا جن کے لیے نہ تو لغت میں کوئی گنجائش ہو، اور نہ کتاب و سنت میں کوئی دلیل ہو!

وہ تمام تاویلات جنھیں وہ متنوع تفسیر قرآن کا نام دیتے ہیں، وہ سب اسی نوع کی ہیں، ملاحظہ ہو ص ۸۰۔

• فاضل مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں اس طرح کی جو بھی اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ سب انہی مذکورہ معانی میں استعمال کی ہیں۔

• اس کے برعکس ہمارے ہاں تقلید جامد کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا مطلب ہوتا ہے علمی دلائل سے دشمنی رکھنا اور کسی ایسی بات پر اصرار کرنا، جس کے لیے کوئی دلیل نہ ہو، سوائے اس کے کہ فلاں فلاں لوگوں نے یہ بات کہی ہے، یا یہ بات پہلے سے چلی آ رہی ہے۔

کھلی ہوئی الزام تراشی

فاضل مضمون نگار زیر بحث شمارے کے ص ۲، پر فرماتے ہیں:

"نظم قرآن کے مؤید اس حلقے کی طرف سے یہ بات بہت ابھار کر کہی گئی ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے اور اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے.... اسی کی اساس پر اس کے سب سے بڑے وکیل مولانا فراہی نے سورۂ فیل کی بالکل طبع زاد تفسیر پیش کی۔"

• نظم قرآن کا مؤید حلقہ، جس کی طرف مضمون نگار کا اشارہ ہے، اس کی طرف سے یہ بات تو بلا شبہ کہی جاتی ہے، اور پورے جزم و یقین کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے۔

• لیکن یہ بات کہیں بھی نہیں کہی گئی ہے کہ اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے۔

یہ بات نہ علامہ فراہیؒ نے فرمائی ہے، نہ ان کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے کہی ہے، نہ اس حلقے کے کسی اور قابل ذکر فرد نے کبھی کہی ہے۔
اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ محض ایک الزام ہے جو اس مکتب فکر کو بدنام کرنے کے لیے تراشا گیا ہے اور یہ کتنا سنگین جرم ہے، یہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں۔
اور اگر یہ جرم کسی عالم دین کی طرف سے ہو تو پھر تو اس کی سنگینی ناقابل بیان ہو جاتی ہے۔
"نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے" اور "اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے" یہ مستقلاً دو باتیں ہیں، جن میں سے ایک کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
پہلی بات تو صد فی صد صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے، جبکہ دوسری بات صد فیصد غلط اور امر واقعہ کے خلاف ہے۔

نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے

"نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے" یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ منزل کا انحصار صحیح راستے اور صحیح سمت سفر پر ہے۔ جو صحیح سمت پر چلے گا وہ منزل تک پہنچے گا، لیکن جس کی سمت سفر ہی غلط ہو، وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔
اب اگر کوئی کہتا ہے کہ منزل کا انحصار صحیح سمتِ سفر پر ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ جو صحیح سمت سفر اختیار کرلے گا، وہ لازماً منزل پر پہنچ کر رہے گا۔ یا مضمون نگار کے اسلوب میں: اس کی بدولت حصول منزل کی امکانی محرومی سے حفاظت کی ضمانت مل جائے گی۔
اس لیے کہ اس کا بہت امکان ہے کہ ایک شخص صحیح سمت سفر اختیار کرلینے کے باوجود منزل سے ہمکنار نہ ہوسکے۔ بایں طور کہ وہ راستے میں کسی حادثے سے دوچار ہو جائے، یا اس کی سواری بے کار ہو جائے، یا اس کا زاد سفر ختم ہو جائے یا وہ بیمار ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔
تو جس طرح صحیح راستے اور صحیح سمت سفر کے باوجود بھی کبھی آدمی اپنی منزل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے دور یا محروم رہ سکتا ہے، اسی طرح نظم قرآن پر ایمان وایقان ہونے کے باوجود بھی ایک طالب قرآن کبھی آیات کی صحیح تاویل تک پہنچنے میں ناکام ہوسکتا ہے۔

وجہ اس کی ظاہر ہے۔ صحیح تاویل تک پہنچنے کے لیے محض نظم قرآن پر ایمان وایقان یا اس کی رعایت ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے کلام عرب کا وسیع مطالعہ بھی ضروری ہے، لغت واسالیب پر گہری نگاہ بھی ضروری ہے، فکر کی پختگی اور ذہن کی رسائی بھی ضروری ہے۔ اہل زبان کے استعمالات اور قرآنی شواہد ونظائر کا استحضار بھی ضروری ہے، عربیت کا ذوق اور زبان کی ادا شناسی بھی ضروری ہے، پھر ان سب چیزوں کے علاوہ قلب ونظر کی طہارت، سیرت وکردار کی نظافت، اللہ سے تعلق اور انابت، کتاب الٰہی سے انس ومحبت، اور گوہر مقصود سے ہمکنار ہونے کے لیے رات دن کی جدوجہد۔ بے تکان جدوجہد ضروری ہے۔

فہم قرآن کے لیے یہ ساری چیزیں ناگزیر ہیں، مگر ان سب کے باوجود نظم قرآن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کے بغیر فہم قرآن کا ہفت خواں طے کرنا ممکن نہیں، بالکل اسی طرح جس طرح سفر کے سارے اسباب ووسائل مہیا ہونے کے باوجود منزل تک پہنچنا ممکن نہیں، اگر سمت سفر صحیح نہ ہو۔

منزل کے لیے جو اہمیت صحیح سمت سفر کی ہے، بالکل وہی اہمیت فہم قرآن کے لیے نظم قرآن کی ہے یہی بات ہے جو کبھی اس طرح بھی کہہ دی جاتی ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے۔

تفسیر سورۂ فیل کا استہزاء

بات بالکل سیدھی سادی اور واضح سی تھی، مگر اسے پہلے تو غلط معنی پہنایا گیا، پھر اسے بنیاد بنا کر ترجمان القرآن علامہ فراہیؒ کے سلسلے میں تضحیک وتمسخر کا ایسا گرا ہوا انداز اختیار کیا گیا جو کبھی کوئی پڑھا لکھا علم دوست انسان نہیں اختیار کرسکتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اسی کی اساس پر اس کے سب سے بڑے وکیل مولانا فراہی نے سورۂ فیل کی بالکل طبع زاد تفسیر پیش کی۔"

یہاں علامہ فراہیؒ کے لیے لفظ "وکیل" کا استعمال اور ان کی تفسیر سورۂ فیل پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبع زاد ہونے کا الزام، یہ دونوں ہی باتیں ایسی ہیں جن پر بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے ؎ بریں ذوق و دانش بباید گریست

اس تفسیر کے طبع زاد ہونے کی دلیل دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"جس کی تردید کے لیے کتاب اللہ میں ارسلنا علیٰ کے مواقع استعمالات پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے .... جس کا استعمال بلا استثناء کتاب اللہ میں مختلف چیزوں کو سرکش اقوام و جماعات پر عذاب الٰہی کے طور پر بھیجنے کے لیے ہے"۔

سوال یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ نے کیا اپنی تفسیر سورۂ فیل میں کہیں یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ چڑیاں اصحاب الفیل کو سلامی اتارتے یا ان کی شان بڑھانے آئی تھیں؟

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چڑیاں ان پر چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسانے آئی تھیں۔ علامہ فراہیؒ یہ فرماتے ہیں کہ وہ خوفناک قسم کی گوشت خور چڑیاں تھیں جو انھیں چیرنے پھاڑنے اور نوچ نوچ کر کھانے آئی تھیں۔

تو کیا اگر اللہ تعالیٰ کسی گروہ یا لشکر کو ہلاک کر کے چیل کووں سے اسے نچوا دے، تو اسے عذاب نہیں کہا جائے گا؟ اگر عذاب نہیں تو اسے اور کیا نام دیا جائے گا؟

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے "ارسلنا علیٰ" کے استعمالات پر اتنا زور کیوں صرف کیا ہے؟ اور کیوں بلا وجہ اس کی خاطر تین صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔

حجر یا حجارہ کا مفہوم

ہم تو آنجناب سے یہ چاہیں گے کہ وہ قرآن پاک یا حدیث صحیح یا مستند کلام عرب میں چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے لیے لفظ حجارہ کا کوئی ایک ہی استعمال دکھادیں تو شاید ان کی بات کچھ لائق اعتنا ہو سکے۔

ہمارے کمپیوٹر کا تو اس پر اصرار ہے کہ لفظ حجر یا حجارہ کا استعمال ہمیشہ بڑے بڑے پتھروں کے لیے ہوتا ہے، جن کا کم سے کم حجم اونٹ کے سر کے برابر ہو اور جن کا کسی چڑیا کی چونچ میں آنا ممکن نہ ہو۔ ورنہ زیادہ تر تو اس کا استعمال پتھر کی بڑی بڑی سلوں اور چٹانوں کے لیے ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لفظ کے چند استعمالات ملاحظہ ہوں:

۱۔ وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانہار (سورہ بقرہ: ۷۴)

(بہت سی چٹانیں ایسی ہوتی ہیں، جن سے چشمے ابل پڑتے ہیں)

۲۔ واذا ستسقیٰ موسیٰ لقومہ فقلنا اضرب بعصاک الحجر (سورہ بقرہ: ۶۰)

(اور یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا۔ تو ہم نے کہا، مارو اپنی لٹھیا چٹان پر)

۳۔ قل کونوا حجارۃ أو حدیدا او خلقا مما یکبر فی صدورکم (الاسراء: ۵۰)

(کہو تم ہو جاؤ پتھر یا لوہا یا کوئی بھی خلقت جو مشکل لگے تمہارے جی میں)

۴۔ وقودھا الناس والحجارۃ (سورہ تحریم: ۶)

(اس کا ایندھن انسان ہوں گے اور پتھر کے بت)

عبید بن ابرص ایک جاہلی شاعر ہے، اس کا شعر ہے:

۵۔ وحوادث الایام لا تبقی لھا إلا الحجارۃ (دیوان عبید بن ابرص)

(اور زمانے کے حوادث کے سامنے نہیں ٹھہرتے مگر پہاڑ)

یہ لفظ حجر اور حجارہ کے چند استعمالات ہیں۔ ان تمام ہی مثالوں میں یہ دونوں الفاظ پہاڑ، چٹان، بڑے بڑے پتھروں یا پتھر کے بتوں کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

اسی طرح مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ نے لفظ حجارۃ کو ان بڑے بڑے پتھروں کے لیے استعمال کیا ہے جنھیں منجنیقوں کے ذریعہ وہ دشمنوں پر پھینکتے تھے۔

۶۔ ولا نقاتل بالعصی ولا نرامی بالحجارۃ (دیوان الاعشیٰ)

ہم لاٹھی ڈنڈوں سے نہیں لڑتے اور نہ ایک دوسرے پر پتھر چلاتے ہیں۔

تفسیر سورۂ فیل کے سلسلے میں سردست اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔ آئندہ کسی صحبت میں اس پر سیر حاصل گفتگو ہوگی۔ اس وقت انشاء اللہ یہ بات روشن ہو کر سامنے آجائے گی کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل طبع زاد اور نری اپج ہے یا ایک بے مثال اور خالص الہامی تفسیر ہے۔ سچ ہے ہیرے کی پرکھ جوہری جانے۔ اب اگر کوئی پرکھنا ہی نہ جانے تو اس میں ہیرے کا کیا قصور!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر علمی اور غیر سنجیدہ اندازِ تحریر

تفسیر سورۂ فیل پر خاک اڑانے کے بعد فاضل مقالہ نگار مزید فرماتے ہیں:

"نظم قرآن کی ایسی ضمانت کے باوجود رجم محصن کی امت کی اجماعی رائے کا انکار کیا گیا اور زانی کی سزا کے سلسلے میں بالکل بے اصل شگوفہ چھوڑا گیا..... اور مقطع کے طور پر اس کی وہ وکالت سامنے آئی جسے انصاف کی زبان میں ظلمات بعضہا فوق بعض کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا" ص ۵۰

قرآن پاک کے ساتھ کیسی بے ادبی اور اس کے سلسلے میں کیسی جسارت ہے یہ کہ ایک بات صاف اور صریح نص قرآن سے ثابت ہوتی ہے، پھر بھی اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کیا زانی کی سزا سو کوڑے قرآن پاک کے نص قطعی سے ثابت نہیں ہے؟

پھر اسے بے اصل شگوفہ قرار دینے کے کیا معنی؟

پھر اگر یہ بات کہی جاتی ہے کہ سورۂ نور کی ابتدائی آیات میں زانی کی جو حد بیان کی گئی ہے، وہ عام ہے۔ اسے غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے خاص کر دینا صحیح نہیں۔ یہ بات عموم لفظ کے بھی خلاف ہے اور نظم کلام کے بھی۔ اس لیے کہ یہاں یہ حد اصلاً شادی شدہ افراد کے ہی سیاق میں بیان ہوئی ہے۔ غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے یہ حد اس لیے قرار پائی کہ ان کے لیے الگ سے کوئی اور حد بیان نہیں کی گئی ہے۔

اگر یہ بات کہی جاتی ہے تو اس کا مذاق اس طور سے اڑایا جاتا ہے کہ یہ تو امت کی اجماعی رائے کا انکار ہے اور اسے انصاف کی زبان میں ظلمات بعضہا فوق بعض کا نام دیا جاتا ہے!

گویا امت کی اجماعی رائے قرآن اور نظم قرآن سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

اور گویا نظم قرآن کا دوسرا نام ظلمات بعضہا فوق بعض ہے۔

پھر یہاں گفتگو چل رہی تھی نظم قرآن کی۔ مقالہ نگار کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ "سخت گیر" نظم قرآن کی بے اعتدالیاں [illegible] لحاظ سے مناسب بات یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی کہ وہ یہاں اپنا "متوازن" نقطۂ نظر پیش کرتے اور جس نظم کے وہ مجوّز ہیں، اور جسے ان کے خیال میں نورٌ علیٰ نور کہنا چاہیے، اس نظم کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے "نورٌ علیٰ نور" فلسفۂ نظم کی کوئی استوار علمی بنیاد نہیں۔ اس کی مثال لکڑی کے اس گھوڑے کی ہے جو بس دیکھنے دکھانے کے لیے تو ہو سکتا ہے، دوڑنا بھاگنا یا کسی مہم کو سر کرنا اس کا کام نہیں ہوتا۔

مجبوراً انھیں گریز کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ مگر گریز کی یہ راہ اختیار کرتے میں بھی انھوں نے ہوش مندی سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے نظم قرآن سے بھاگ کر اجماع کے دامن میں پناہ لی۔ مگر یہ اجماع چونکہ بس ایک فرضی اجماع تھا، جس کی کوئی اصلیت نہ تھی، اس لیے وہ انھیں حقیقت سے قریب تو کیا کرتا، مزید دوری کا سبب بن گیا۔

یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے کہ یہ امت کی اجماعی رائے کا انکار ہے۔ اگر اس سے مراد صحابہ کرام، تابعین عظام اور فقہائے امت کی رائے ہے تو یہ بات سرتاسر حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے، جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ادارہ احیائے دین۔ بلریا گنج کی تازہ پیش کش "حقیقت رجم"۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ

فاضل مقالہ نگار اس سلسلے میں مزید زعفران پاشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حقیقت رجم جیسے مجموعۂ اغلاط اور مجموعۂ التباسات کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا..... اس کتاب کے پیدا کردہ فکری انحراف کی اصلاح امت پر بطور فرض کفایہ واجب ہے"۔ صہ ۸۸

یہ کتاب جو تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ضخیم کتاب ہے اور اس میں جو بات کہی گئی ہے، اس ایک بات کو کہنے کے لیے نہ جانے کتنی لائبریریاں کھنگالنی پڑی ہیں۔ یہ کتاب جو قرآن وسنت اور اجماع امت کے انتہائی محکم دلائل پر مشتمل ہے، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے سلسلے میں اتنی احتیاط برتی گئی ہے کہ اسے کاتب کے حوالہ کرنے سے پہلے متعدد مستند اور دیدہ ور علماء کی نظر سے گزارا گیا ہے، جب تک اس کے مضامین و مشتملات کے سلسلے میں شرح صدر نہیں ہوگیا، اسے کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا۔

ایک ایسی کتاب کے سلسلے میں یہ بے بنیاد دعویٰ کتنی آسانی اور بے تکلفی کے ساتھ کیا گیا ہے، کہ یہ مجموعۂ اغلاط و التباسات ہے۔

کاش یہ فتویٰ صادر کرنے سے پہلے اس کی کسی ایک غلطی یا کسی ایک التباس کی نونشاندہی کی جاتی۔ لیکن یہ مضمون نگار کا کام تھا ہی کب؟

ان کا کام تو بس اسی فتوے تک محدود تھا، کہ امت پر یہ "فرض کفایہ" ہے کہ اس فکری انحراف کی اصلاح کرے۔ ص۶

سر بکف ہم جو بڑھے دین کی نصرت کو حفیظ
کفر کا فتویٰ لگا شیخ حرم کے ہاتھوں

اب تک تو ہم یہ پڑھتے اور سنتے آئے تھے کہ واجبات و فرائض کی تعیین خدا اور رسول کا کام اور ان کا یہ منصب ہے، لیکن آج معلوم ہوا کہ نہیں، ہمارا سلطان بھی یہ حق رکھتا ہے۔ کہ جس چیز کو چاہے، محض اپنے ذوق وطبیعت سے فرض اور واجب قرار دے، اور جسے چاہے غلط اور فاسد کہہ دے۔ اسے کتاب وسنت سے کوئی دلیل لانے اور کسی چیز کی فرضیت یا حرمت کا کوئی علمی ثبوت پیش کرنے کی حاجت ہے۔

چنانچہ اسی ایک مضمون میں دو باتوں کے فرض کفایہ ہونے کا اعلان عام کر دیا ہے۔ ایک تو یہی بات جس کا ابھی ذکر آیا۔

دوسرے امام ابو داؤد کی طرف منسوب ایک نامعلوم کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ان کی کتاب "نظم القرآن" جسے تلاش وجستجو سے منظر عام پر لانے کو امت پر فرض کفایہ ہونا چاہیے۔" ص۸۹

اسی ایک مضمون میں انھوں نے دُو دُو فرائض کا اعلان کر دیا ہے اور اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنے فرائض کا اعلان کر چکے ہوں گے۔

ان طبع زاد یا خود ساختہ فرائض کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس کا فیصلہ تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات مفتیان کرام ہی کریں گے۔ البتہ "حقیقت رجم" کے تعلق سے جس فرض کفایہ کا اعلان ہوا ہے، اس کے سلسلے میں اتنی گذارش کرنی ضروری ہے کہ یہ اعلان جس طرح علم و تحقیق اور دین و اخلاق کے تعلق سے عائد ہونے والی تمام ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر کیا گیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ فرض ادا کرنے والے بھی اسی روش پر چل پڑیں۔ اس کے برعکس ان کا یہ فرض ہے کہ وہ علم و تحقیق کے بنیادی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کام انجام دیں۔

بحث و تحقیق کی نادر مثال

فاضل مقالہ نگار اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"بعد کی پیڑھی میں دوسرا قابل ذکر نام مولانا عنایت اللہ سبحانی، جن کا علامہ فراہی کے نظم قرآن پر پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ "البرهان في علوم القرآن" ضخیم کتاب کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے"۔ ص ۸۴

پھر آگے وہ مزید فرماتے ہیں:

"اس سلسلے کا سب سے نمایاں نام ابوحیان اندلسی ۷۴۵ھ کی "البرہان فی ترتیب سور القرآن" مدرسۃ الاصلاح کے کتب خانہ میں، اس کے مخطوطے پر مولانا مسعود عالم ندوی کا تحریر کردہ یہ نوٹ ہے ..... کہا جاتا ہے کہ مولانا فراہی کے نظم قرآن پر مولانا سبحانی کی مذکورہ عربی کتاب اسی مخطوطے کا چربہ ہے، اس پس منظر میں ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ایک دلچسپی کا موضوع ہے" ص ۸۵

قابل صد مبارک باد ہے ادارۂ تحقیق کہ اسے ایک ایسے بے مثال محقق کی خدمات حاصل ہیں، جس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس محقق بے مثال کی شانِ تحقیق یا کمال تحقیق کا اندازہ کرنے کے لیے درج ذیل باتوں کا جان لینا کافی ہوگا:

(۱) البرہان فی ترتیب سور القرآن جسے ہمارے محقق نے ابوحیان اندلسی کی طرف منسوب کیا ہے، وہ ابوحیان اندلسی کی نہیں بلکہ علامہ ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر اندلسی غرناطی کی کتاب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) محمد عنایت اللہ سبحانی کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھیسس جس کا نام ہمارے محقق نے "البرہان فی علوم القرآن" بتایا ہے، وہ صحیح نہیں، صحیح نام "البرہان فی نظام القرآن" ہے۔

(۳) البرہان فی ترتیب سور القرآن جس کا مخطوطہ مدرسۃ الاصلاح کے کتب خانے میں ہے، اور جس کا حوالہ ہمارے ماہر محقق نے دیا ہے، اس کے صفحات کی مجموعی تعداد جلی خط سے ایک سو تریسٹھ ۱۶۳ صفحے ہے۔ ان ایک سو تریسٹھ صفحات میں قرآن پاک کی تمام سورتوں پر علامہ ابوجعفر ابن الزبیر کے نہایت ہی مختصر اور سرسری تعارفی نوٹس (Notes) ہیں۔

مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ متعین طور سے سات سطریں ہیں۔ سورۂ بقرہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ پونے چار صفحے ہیں۔ سورۂ آل عمران پر جو کچھ لکھا ہے وہ ڈیڑھ صفحے ہیں۔

اس طرح اس کتاب میں سورۂ فاتحہ، بقرہ، آل عمران پر علامہ ابوجعفر بن الزبیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ ساڑھے پانچ صفحے سے زیادہ نہیں ہے۔

جب کہ برہان فی نظام القرآن جسے علامہ ابوجعفر کی کتاب کا چربہ کہا گیا ہے، اور جو انہی تین سورتوں۔ فاتحہ، بقرہ، آل عمران ۔ کے نظم آیات پر مشتمل ہے، وہ بڑی تقطیع اور کمپیوٹر کے باریک خط سے ۶۳۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ضخیم کتاب ہے۔ تو کیا ساڑھے پانچ صفحے کا چربہ ۶۳۰ صفحات میں اتارا گیا ہے؟

حقیقت رجم کس کتاب کا چربہ؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ماہر محقق نے ان دونوں کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب نہیں دیکھی ہے۔ اب اس کو تحقیق کا کمال نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے کہ ہمارا محقق کسی بھی کتاب کو دیکھے اور پڑھے بغیر نہایت ہی دوٹوک انداز میں اس کے بارے میں اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر سکتا ہے، اور برملا اس کا اعلان بھی کر سکتا ہے۔

ہمارے لیے کتنی خوشی کی بات ہوتی اگر ادارۂ تحقیق کا یہ فاضل محقق "حقیقت رجم" کو بھی اسی طرح کسی مفسر یا محدث کی کسی کتاب کا چربہ ثابت کر دیتا۔ ویومئذ یفرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ألمؤمنون بنصر اللہ !

غلط اور غیر محتاط محاورے

یہ تو ان غلطیوں کا ذکر ہوا جو علمی، فکری، ذوقی اور اخلاقی کہی جا سکتی ہیں۔ اب یہاں ہم ان کی ادبی اور لسانی غلطیوں کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار کی تحریروں میں غلط اور غیر محتاط محاوروں کی بھرمار ہوتی ہے مثال کے طور پر وہ ص۴۳ پر لکھتے ہیں :

"کتاب اللہ میں ارسلنا علی کے مواقع استعمالات پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔"

اس جملے میں (مواقع استعمالات) کا استعمال غلط ہے۔

یا تو کہا جائے گا: "ارسلنا علی کے استعمالات" ورنہ کہا جائے گا "ارسلنا علی کے مواقع استعمال"۔ مواقع کے ساتھ "استعمالات" بصیغۂ جمع کا استعمال صحیح نہیں۔

اسی طرح "ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے" کے بجائے کہا جائے گا "ایک نظر ڈال لینی ہی کافی ہے" اس لیے کہ نظر مذکر نہیں، مونث ہے۔

اسی مضمون میں ایک دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں :

"اس لیے سراپا علم وحکمت ذات خداوندی کی اس ترتیب میں ..." ص۶۹

"سراپا علم وحکمت" کی ترکیب اس ذات بے ہمتا کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔ اس ترکیب سے گمان ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ ہمارا رب کوئی انسان ہے، یا انسان نما کوئی چیز ہے، جس کے سر اور پیر ہیں۔ یہ تجسیم کا تصور سرتاسر غلط، اس کی شان عظمت کے منافی اور قرآن وسنت کی تعبیرات کے خلاف ہے۔

رسول خدا اور قرآن کا دورہ

اسی مضمون میں ص۸۶ پر وہ رقم طراز ہیں :

"اللہ کے رسول اپنے وصال سے قبل ہر رمضان میں کتاب اللہ کا حضرت جبریل کے روبرو دورہ کرتے تھے۔ جس سال آپ کا وصال ہوا، اس سے متصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رمضان میں یہ دورہ معمول سے ہٹ کر دوبار ہوا۔"

رمضان کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام کی باہم جو مجلسیں ہوتی تھیں، اور جس میں قرآن پاک کی تلاوت و مداومت ہوتی تھی، ان کے لیے فاضل مقالہ نگار نے لفظ "دورہ" کا استعمال کیا ہے اور ایک بار کئی بار کیا ہے۔

حضرت جبریلؑ اور حضور پاکؐ کے باہم قرآن پڑھنے پڑھانے کے لیے لفظ "دورہ" کا استعمال کسی طرح صحیح نہیں۔ لفظ دورہ کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اس کے سلسلے میں ہمارے بزرگ استاذ حضرت مولانا جلیل احسن ندویؒ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جس زمانے میں وہ مدرسہ مصباح العلوم بریلی میں بحیثیت مدرس کام کر رہے تھے، وہاں ان کے پاس ایک عرب شیخ، جو بریلی میں رہتے تھے، وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے:

یا أستاذ جلیل، هل تعرف ما الدورة؟ الدورة ان تحوم حول الحدیث ولا تدخل فیه!

(استاذ جلیل، کیا تمہیں معلوم ہے کہ دورۂ حدیث کیا چیز ہے؟ دورۂ حدیث کا مطلب ہوا کرتا ہے کہ تم حدیث کے ارد گرد گھومتے رہو، لیکن اس میں داخل نہ ہو!)

عرب صاحب نے لفظ دورہ کی جو تشریح کی تھی، وہ بالکل صحیح تھی۔ لفظ دورہ کے اندر بنیادی طور پر عجلت، سرعت اور سرسری نظر کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ بے سمجھے بوجھے رواں دواں عبارت خوانی کا نام "دورہ" ہے۔ اب کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ اس لفظ کا استعمال رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیونکر درست ہوگا؟

اسی مضمون کے ص۸۳ پر وہ لکھتے ہیں:

"مدارس عربیہ کا مقصد امت کی متنوع دینی ضروریات کی تکمیل ہے۔ صرف نظم قرآن کی بانسری بجانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔"

نظم قرآن کی بانسری بجانے کا محاورہ کتنا غیر سنجیدہ ہے! اس محاورے کا استعمال کھلی ہوئی بدمذاقی بھی ہے اور کتاب الٰہی کے ساتھ صریح بے ادبی بھی!

سخت گیر نظم قرآن

فاضل مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں بار بار نظم قرآن کے لیے "سخت گیر"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صفت استعمال کی ہے، مثلاً:

"کہنے کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ سخت گیر نظم قرآن ہی فہم قرآن کی کلید ہے۔" ص۲

"اب اگر سخت گیر نظام قرآن کی بدولت ہر لفظ کے ایک ہی معنی..... کی گنجائش رہے۔" ص۷۹

یہ دو مثالیں ہوئیں، ورنہ اس مضمون میں نظم قرآن کے لیے بار بار یہ صفت استعمال کی گئی ہے۔

یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ قرآن اور نظم قرآن ایک ہی چیز ہے اور "سخت گیر" کی صفت یہاں اسی قرآن یا نظم قرآن کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ یہاں "سخت گیر" کی صفت اچھے معنوں میں نہیں بلکہ بطور ہجو اور مذمت کے استعمال کی گئی ہے۔

اب کوئی فاضل مضمون نگار سے پوچھے کہ نظم قرآن یا نظام قرآن کے لیے یہ صفت مذمت استعمال کر کے انھوں نے کس کی ہجو یا کس کی مذمت کی ہے؟ حمید الدین فراہی کی یا اس خدائے ذوالجلال کی جس نے یہ کتاب اتاری ہے؟

زیر نظر مضمون میں الفاظ اور محاورے کی اس طرح کی غلطیوں کی کمی نہیں، لیکن یہاں ان غلطیوں کا استقصا مقصود نہیں۔ یہ چند نمونے ہیں۔ یہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم مضمون نگار سے پوچھیں: شعر گفتن چہ ضرور؟ اگر شعر و ادب کا سرے سے ذوق نہ ہو تو کیا حاصل بلاوجہ کی تک بندی کا؟

الجھا ہوا اندازِ تحریر

فاضل مضمون نگار کی یہ تحریر ہو یا کوئی بھی تحریر، اس کے اندر زبردست الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"اس روشنی میں دیکھا جائے تو انسانی تصنیفات کے انداز پر ازاول تا آخر سخت گیر نظم قرآن کے فلسفہ کو بھی بجائے صلب العلم کے ملح العلم کے زمرے میں لانے سے مفر نہیں۔" ص۷۶

خط کشیدہ عبارت میں جو الجھاؤ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ عجب نہیں کہ خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب عبارت کے لیے اس کی سیدھی سادی تشریح دشوار ہو جائے۔

ایک دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں :

"تیسرے طبقے میں مفسرین کی وہ قلیل جماعت ہے جو پورے التزام اور سختی سے نہ صرف یہ کہ ایک سورہ کی تمام آیات کو ایک دوسرے سے مربوط مانتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک سورہ کا دوسری سورہ سے نظم قائم کرتا ہے اور اس طرح اول تا آخر کتاب اللہ کو ایک مکمل مربوط و منظم کتاب کی صورت میں پیش کرتا ہے، جس سے اعلیٰ اور برتر نظم و ارتباط کسی انسانی اور غیر انسانی تصنیف میں نہیں کیا جا سکتا۔" ص۶۷

خط کشیدہ عبارت پر غور کیجئے، اس میں جو الجھاؤ ہے وہ اس قدر فاحش ہے کہ خود مضمون نگار کے لیے اس کی تشریح دشوار ہوگی۔ بلکہ عجب نہیں کہ وہ تشریح کرتے کرتے پسینہ سے شرابور ہو جائیں؟

یہاں یہ بات بھی نظر انداز کرنے کی نہیں کہ اس عبارت میں مضمون نگار نے "قلیل جماعت" کو ایک بار نہیں بار بار مذکر استعمال کیا ہے۔ کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ یہ "قلیل جماعت" باوجود قلیل ہونے کے اپنی ہیبت وسطوت اور دبدبہ کے اعتبار سے مضمون نگار کو ایک لشکر جرار کی شکل میں نظر آرہی ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزوۂ بدر میں بھی تو ایسا ہی ہوا تھا، نصرت الٰہی کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی ہے۔

نظم قرآن کا بوجھ

مضمون نگار ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"یون صدی کے عرصہ میں حدیث وفقہ سے بے اعتنائی کے ساتھ اس میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے اس کے تقاضے سے فوری طور پر مادر علمی سے نظم قرآن کے بوجھ کو کم کرنا چاہیے۔" ص۸۲

حدیث وفقہ سے بے اعتنائی کے نتیجہ میں اگر ان دونوں چیزوں میں کمزوری پیدا ہوئی تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث وفقہ سے بے اعتنائی نہ برتی جائے یا یہ تقاضا ہے کہ مادر علمی سے نظم قرآن کا بوجھ کم کیا جائے؟!

ختم شد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تو بالکل اسی طرح کی بات ہوئی کہ ہم کسی شخص سے کہیں، کہ کھانے پینے کے سلسلے میں لاپرواہی سے تمہارے جسم میں جو کمزوری پیدا ہوگئی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ فوری طور سے تم سانس لینا کم کر دو!

بتائیے اس دانشوری کا کیا علاج! یا اس فرزانگی کا کیا جواب!

- پھر نظم قرآن کا بوجھ کم کرنے کا مطلب کیا ہے؟ آیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مادر علمی میں قرآن پڑھایا جائے اور دن میں جو دو ایک پیریڈ قرآن کے ہوتے ہیں وہ حدیث وفقہ کو دیدیے جائیں؟۔
- کیا حدیث وفقہ سے دلچسپی کا مطلب ہے قرآن سے دشمنی؟ کیا قرآن سے دشمنی یا محرومی کے بغیر حدیث وفقہ کی تعلیم ممکن نہیں؟

اس عبارت سے مضمون نگار کا مقصد کیا ہے؟ شاید وہی اس کی کچھ وضاحت کر سکیں ورنہ ایک عام قاری تو اس طرح کی عبارتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

یہ الجھے ہوئے انداز تحریر کے چند نمونے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری ہی تحریریں اس خصوصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

یہ تحریر کا الجھاؤ اپنی حقیقت کے لحاظ سے محض تحریر کا الجھاؤ نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ صاحب تحریر کی شخصیت کا الجھاؤ ہوتا ہے اس کے ذہن وفکر کا الجھاؤ ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت اور اس کے مزاج کا الجھاؤ ہوتا ہے۔

حرف آخر

- یہ ہے جناب سلطان احمد اصلاحی کا فلسفۂ نظم قرآن اور یہ ہے اس کا ایک سرسری جائزہ۔
- سرسری جائزہ اس لیے کہ یہ پورے مضمون کا جائزہ نہیں ہے بلکہ مضمون کے صرف اس حصہ کا جائزہ ہے جس میں انھوں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے، اور گفتگو کا بالکل منفی انداز اختیار کیا ہے اور اس حصہ کا جائزہ بھی پورے طور سے نہیں لیا جا سکا اس لیے کہ اس مضمون کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی جزء بھی صحت مند نہیں ہے۔ ایک ناقد حیران رہ جاتا ہے کہ کن کن باتوں پر گرفت کرے۔

© rasailojaraid.com